مختصر افسانہ

مختصر افسانہ اردو نثر کے تخلیقی ادب میں سب سے کم عمر اور نوخیز صنف ہے لیکن اس صنف نے اپنی کم عمری اور نوخیزی کے باوجود ایسی فنی پختگی اور مقبولیت حاصل کرلی جس سے سرسری طور پر گزر جانا کسی کے لئے بھی اب ممکن نہیں ہے۔ یہ صنف قدم قدم پر فکر وفن کا ایسا جلال و جمال پیش کرتی ہے جس سے ذہن کو نور اور دل کو سرور حاصل ہوتا ہے۔ اس کے آئینے میں ہمیں جہاں اپنے ملک، قوم اور سماج کی تصویر نظر آتی ہے، وہیں ہماری زندگی میں پیش آنے والی دشواریوں یا غم والم اور مسرت وشادمانی کی جھلکیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اردو میں مختصر افسانہ مغربی ادب کے زیر اثر وجود میں آیا اور بہت کم عرصے میں اس نے اردو میں ایک اہم صنف کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کرلی اور عام لوگوں کے درمیان اسے خوب مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔

افسانے کی متعدد تعریفیں کی گئی ہیں۔ ایک ممتاز مغربی ادیب کا کہنا ہے کہ افسانہ ایسی نثری کہانی ہے جو ایک ہی نشست میں پڑھی جاسکے۔ کسی نے یہ بھی کہا ہے کہ افسانے میں بنیادی شئے وحدت تاثر ہے۔ بہرحال ادب اور فن کے ماہرین نے اس کی جو بھی تعریفیں بیان کی ہیں ان سب کے درمیان ایک خیال مشترک ہے کہ افسانہ نثر میں ایک مختصر بیانیہ تخلیقی صنف ہے۔ افسانے میں کسی ایک کردار یا کرداروں کے ایک مخصوص گروہ کے نقوش یا ذہنی کشمکش کو نمایاں کیا جاتا ہے۔ افسانے میں واقعات کی تفصیل، کرداروں کی گفتگو اور منظر و ماحول کی پیش کش بہت نپی تلی اور متوازن ہوتی ہے۔

اردو میں مختصر افسانے کا آغاز بیسویں صدی کی ابتدا میں ہوا اور اس صنف نے تقریباً اپنے سو سالہ سفر میں کئی نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ متفقہ رائے کے مطابق اردو کا پہلا مختصر افسانہ 'نصیر اور خدیجہ' کو تسلیم کیا جاتا ہے جو 1903 میں شائع ہوا۔ اس کے مصنف راشد الخیری تھے۔ اس کے بعد پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم کے افسانے سامنے آئے۔

1936 میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا۔ اس سے چند سال قبل 'انگارے' کے نام سے ایک مجموعہ شائع ہو چکا تھا، جس نے موضوع اور فن دونوں اعتبار سے اردو کے مختصر افسانے کی تاریخ میں نئے تجربوں کی بنیاد ڈالی اور یہ مجموعہ آج بھی ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

1960ء کی دہائی میں جدید افسانہ نگاروں کی ایک نئی نسل ابھر کر سامنے آئی جس نے حقیقت نگاری سے انحراف کیا اور افسانے میں علامت، استعارہ، تمثیل اور تجرید کی آمیزش کر کے اردو کے افسانے کا افق مزید وسیع کیا۔ اس عہد کے افسانہ نگاروں میں انتظار حسین، سریندر پرکاش، انور سجاد، بلراج کومل، غیاث احمد گدی اور کلام حیدری وغیرہ بہت اہم ہیں۔

اردو افسانے کی تاریخ میں منشی پریم چند، سجاد حیدر یلدرم، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس، سہیل عظیم آبادی، اختر اورینوی، رام لعل، شکیلہ اختر اور جوگندر پال کی خدمات کو ہم کبھی فراموش نہیں کرسکتے ہیں۔

سہیل عظیم آبادی

سہیل عظیم آبادی کا اصل نام سید مجیب الرحمٰن ہے۔ اپنی ابتدائی زندگی میں شاعری بھی کرتے تھے۔ اسی لئے سہیل تخلص کرتے تھے۔ اس طرح ادبی دنیا میں سہیل عظیم آبادی کے نام سے مشہور ہوئے۔ سہیل عظیم آبادی کی پیدائش 1911ء میں پٹنہ میں ہوئی۔ سہیل صاحب ایک زمیندار خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک سال کی عمر میں والدہ کا انتقال ہوگیا اور پرورش ننہیال میں ہوئی۔ ایک معلم کی سرپرستی میں وہیں ابتدائی تعلیم و تربیت حاصل ہوئی۔ ویسے ان کا آبائی وطن شاہ پور، بھدول ہے جو پٹنہ ضلع میں ہی واقع ہے۔ افتادِ طبع کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کر سکے۔ گرچہ مظفر پور، حیدرآباد اور کلکتہ جیسے علمی مراکز میں قیام پذیر رہے۔ ابتداء شاعری سے کی لیکن آگے چل کر افسانہ نگاری کی طرف مائل ہوئے۔ پھر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور بیشمار افسانے لکھے۔

سہیل عظیم آبادی نے آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت اختیار کی۔ اس ملازمت کے سلسلے میں دہلی میں رہے پھر ان کا تبادلہ شری نگر کشمیر ہوگیا پھر وہ واپس پٹنہ چلے آئے اور ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ اس سے پہلے صحافت میں بھی مصروف رہے۔ رسالے نکالے اور ایک روزنامہ اخبار 'ساتھی' کا اجراء کیا۔

سہیل عظیم آبادی زندگی بھر اردو کی ترویج و اشاعت میں مصروف رہے۔ چنانچہ انہوں نے چھوٹا ناگپور کے علاقے میں پانچ سات برسوں تک اردو کی ترویج و اشاعت کا کام کیا۔ زمیندارانہ ماحول سے تعلق اور چھوٹا ناگپور کے قیام نے ان کے افسانوں کے موضوعات متعین کر دیئے۔ ان کے اکثر و بیشتر افسانے زمینداروں کے استحصال کے خلاف مزدوروں اور کمزور طبقوں کی حقوق جیسے موضوعات سے متعلق ہیں۔

سہیل عظیم آبادی کی تخلیقات میں ان کے تین افسانوی مجموعے چار چہرے، الاؤ، اور 'آدمی کے روپ ہیں اور ایک ناول 'بے جڑ کے پودے' ہے۔ ان مجموعوں کے علاوہ سہیل کے افسانوں کی تعداد ۱۲۵ تک پہنچتی ہے۔ 1980ء میں سہیل عظیم آبادی کا انتقال ہوگیا۔

بھابی جان

جب رقیہ بھابی یاد آتی ہیں تو میرا سر خود بخود جذبۂ احترام سے جھک جاتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ان کی ذات سراپا روشنی ہے۔ ان کی یاد کے ساتھ ساتھ مجھے وہ شمع یاد آجاتی ہے جو کلیسا کی اونچی قربان گاہ پر جلتی اور پگھلتی رہتی ہے اور جب پادری عبادت ختم کر کے قربان گاہ سے اتر جاتا ہے تو بھی وہ خاموش زبان سے خداوند یسوع کا پیغام سناتی رہتی ہے جو دوسروں کا گناہ بخشوانے کے لئے صلیب پر چڑھایا گیا۔ مگر وہ جو اب تک زندہ ہے اور قیامت تک زندہ رہے گا اور سب کو نجات دلائے گا۔

رقیہ بھابی کی ذات مجھے ایسی ہی شمع معلوم ہوتی ہے جو جلتی اور پگھلتی رہتی ہے۔ لیکن روشنی پھیلاتی اور کچھ کہے بغیر بھی ہر وقت ایک پیغام سناتی رہتی ہے۔ ایسا پیغام جو امر ہے۔

بھابی نے صبح سویرے آواز دی—

'خیر تو ہے شہزادے! گھوڑے بیچ کر سوئے ہو۔ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔'

بھابی کی آواز سن کر میں اٹھ بیٹھا۔ وہ مسکرا دیں اور بولیں—

'بھئی بات یہ ہے کہ ٹھنڈی چائے مجھ سے پی نہیں جاتی اور بچوں کو اسکول بھیجنا بھی ہے۔'

'بھابی یہی تو مصیبت ہے آپ کے ساتھ۔ صبح ہوئی اور اٹھا کر بٹھا دیا۔ ہم لوگوں کو بھی آپ طالب علم سمجھتی ہیں؟'

بھابی بولیں— 'تو آج تم کون بوڑھے ہو چکے ہو۔ بھئی اٹھو جلدی کرو۔'

بھابی نے ہاتھ پکڑا اور بستر سے کھینچ لیا۔ میں زمین پر کھڑا ہو گیا۔ وہ ہنسنے لگیں۔

میں بولا— 'شکر ہے میں آپ کا اسٹوڈنٹ نہیں ہوا۔'

'باتیں نہ بناؤ۔ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ بچے بیٹھے ہیں۔'

'لیکن مجھے نیند آرہی ہے بھابی۔ رات بھر نہیں سو سکا ہوں۔' میں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

'چائے کے بعد دوسری قسط سو لینا۔'

قسط کا لفظ سن کر میں ہنس پڑا۔ اور وہ بولیں—

'شاعر ہو کر داد نہیں دیتے۔ کیا لفظ میں نے استعمال کیا ہے۔ اگر نوابان اودھ باقی ہوتے تو اس ایک لفظ کے استعمال پر ایک جاگیر تو ضرور بخش دیتے۔ چلو بھئی تم ذرا جلدی کرو۔ اتنا ہی سہی۔'

اور بھابی کھانے کے کمرے میں چلی گئیں۔ اور جب تھوڑی دیر میں میں میز پر پہنچا تو بچے چائے ختم کر رہے تھے۔ ننھی ریحانہ بولی—

'چچا جان! ہم لوگ چائے ختم کر چکے ہیں۔ اب آپ ہماری جھوٹی چائے پیجئے۔'

اسکول کی لاری نے ہارن بجایا اور بچیاں تالی بجاتی ہوئی باہر چل دیں۔ بھابی نے چائے ڈھال کر میری طرف بڑھائی اور بولیں— 'اگر تم جوان اتنی دیر تک سوتے رہو گے تو کیا کرو گے۔'

'شعر کہوں گا اور کیا کروں گا۔'

'اور کچھ نہیں۔'

بھابی معنی خیز انداز سے مسکرائیں۔ میں کچھ جھینپ سا گیا۔ بھابی کی مسکراہٹ بہت دور تک اشارے کر رہی تھی۔ پھر وہ آہستہ سے بولیں—

'تمہارے بھائی جان ٹھیک چار بجے اٹھ بیٹھتے تھے اور چائے پی کر کام شروع کر دیتے تھے۔ شروع میں تو مجھے بھی بڑا جبر ہوتا تھا لیکن آج صبح اٹھنے کی عادت کام آرہی ہے۔'

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ بھابی کی سنگار میز پر ننھے بھائی کی خوبصورت سی رنگین تصویر رکھی ہوئی تھی۔ وہ مسکرا رہے تھے۔ اس تصویر کے پاس بھابی اور بچوں کی تصویریں تھیں۔ اب سنگار میز نام کا تھا۔ اس پر بچوں کی کتابوں کا ڈھیر تھا اور شاید ایک کنگھی کے علاوہ میز پر سنگار کی کوئی دوسری چیز بھی نہ تھی۔ رقیہ بھابی اداس ہو گئیں اور بولیں—

'اختر! نہ جانے تمہارے بھائی جان آج کس حال میں ہیں۔ دیکھو ان کے مقدمے کا کیا ہوتا ہے۔ ہزار میل

کی دوری پر میں ان کے کوئی کام بھی نہیں آسکتی۔ چند ہی دنوں میں ان کے مقدمے کا فیصلہ ہونے والا ہے۔'

بھابی جو ہمیشہ پھول کی طرح ہنسنے اور بلبل کی طرح چہکتے رہنے کی عادی تھیں بالکل اداس اور چپ تھیں۔ لیکن یکا یک کسی کے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ پھر آواز آئی۔

'میں آسکتی ہوں۔'

'آجاؤ۔' بھابی نے کہا۔

اور ایک جوان سی لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔ بھابی نے دیکھتے ہی کہا۔

'آؤ شمی! چائے پیو۔ میں آج شام کو تمہارے گھر جانے والی ہی تھی۔ بن دیئے تم نے سوئیٹر؟'

'وہی لے کر آئی ہوں۔ اون بچ گیا تھا تو میں نے ٹوپی اور موزے بھی بُن دیئے۔'

'بہت اچھا کیا تم نے۔ لو چائے پیو۔'

اور چائے کی پیالی لڑکی کے سامنے بڑھادی۔ لڑکی میری موجودگی میں کچھ شرما رہی تھی۔ بولی۔

'میں چائے پی چکی ہوں۔'

'پھر بھی پی لو۔ شرماتی کیوں ہو؟ یہ ہیں مشہور شاعر اختر۔ تمہارے بڑے بھائی ہیں۔'

میں ناشتہ ختم کر چکا تھا۔ اٹھ کھڑا ہوا۔

'بھابی میں ذرا شہر سے ہو آؤں؟'

'جاؤ۔ مجھے بھی ذرا ہسپتال جانا ہے۔ چلو شمی تم بھی ساتھ۔'

میں نے کمرے کی کھڑکی سے بھابی کو بنگلے کے احاطے سے باہر جاتے دیکھا۔ ان کے ہاتھ میں دودھ کی وہ بوتل تھی جو بہت دیر سے میز پر رکھی ہوئی تھی۔ یہ تو مجھے دو دن کے بعد معلوم ہوا کہ بھابی کے ایک پرانے ملازم کی بیٹی ہسپتال میں ہے۔ دو مہینے پہلے اس کے شوہر کا انتقال ہو گیا تھا اور اس کے بچہ پیدا ہوا ہے اس کا کوئی بھی دیکھنے والا نہیں۔ بھابی خود ہی دونوں وقت دودھ کی بوتل لے کر دو فرلانگ پیدل جاتی اور دودھ پہنچاتی ہیں اور سوئیٹر اور موزے اسی بچے کے لئے بنوائے تھے۔ کیونکہ سردی کا موسم شروع ہو رہا تھا اور شمی ان کے کالج کی ایک غریب طالب علم تھی جو صرف ان کی مدد کے سہارے پڑھ رہی تھی۔

بھابی سے میری صرف دوسری یا تیسری ملاقات تھی۔ البتہ خط و کتابت بہت زیادہ تھی۔ لیکن تین دن ساتھ رہ کر معلوم ہوا کہ وہ آدمی نہیں، مشین تھیں۔ صبح اٹھ کر کام شروع کر دیتیں ان کا زمانہ بھی بالکل بدل چکا تھا۔ کبھی چار پانچ نوکر اور مامائیں ہوتی تھیں، اب ان کے پاس صرف ایک نوکر تھا جو بازار سے سودا لاتا تھا اور کھانا بھی پکاتا تھا۔ پھر روپیوں کی بھی بڑی تنگی تھی۔ پہلے وہ ہزاروں روپے ماہوار اپنے شوق پر خرچ کر دیا کرتی تھیں۔ اب چار سو روپے ماہوار پر ایک کالج میں لکچرر تھیں اور پچاس روپے ماہوار ایک لڑکی کو پڑھانے کے ملتے تھے۔ لے دے کر یہی ان کی آمدنی تھی۔ اور خرچ اپنی جگہ پر۔ بلکہ کچھ زیادہ ہی۔ اپنے اور بچوں کا خرچ ہوتا تو کسی طرح پورا ہو جاتا۔ لیکن وہ بھی بڑھ گیا تھا۔ بچوں اور اپنی ضرورتوں کے علاوہ ایک مستقل رقم انہیں ہر مہینہ مزدوروں اور طالب علموں کی انجمنوں کو دینا پڑتی تھی۔ کانفرنسوں اور جلسوں میں شرکت کے لئے کرایہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ کئی غریب لڑکیاں صرف ان کی مدد سے پڑھ رہی تھیں۔

بھائی جان کی جب شادی رقیہ بھابی سے ہوئی تھی۔ تو ہم لوگوں کا عام خیال تھا کہ یہ شادی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ایک طرف بھائی جان تھے، جنہیں ایسی سیاست سے شوق تھا، جو بار بار انہیں جیل بھجوایا کرتی تھی اور دوسری طرف بھابی جان تھیں، جو نازوں کی پالی تھیں اور ایسی ماحول میں بڑھ کر جوان ہوئی تھیں جس میں اپنی ہی ذات سب کچھ ہوتی ہے اور ہم لوگوں نے شادی کی خبر سنتے ہی سوچ لیا تھا کہ بھابی جس طرح ابھی میکے میں شان سے رہتی ہیں، رہا کریں گی اور بھائی جان جیل میں رہیں گے۔ بعضوں کا تو یہ خیال تھا کہ بھائی جان بھی سیاست کے چکر سے نکل کر بیرسٹری کریں گے اور اپنی عالی شان کوٹھی میں شان کی زندگی گزاریں گے یا پھر آرام کرسی والی سیاست چلے گی اور کتابوں کی باتیں دہرائیں گے۔ لیکن سب کا خیال غلط نکلا۔ بھائی جان نے رقیہ بھابی کو اپنے رنگ میں جلد ہی رنگ دیا۔ اور وہ قدم بقدم ساتھ چلنے لگیں اور شادی کے بعد جیسے ہی بھائی جان گرفتار ہوئے اور انہیں دو سال کی سزا ہو گئی۔ بھابی جان نے اپنے لئے راہ تلاش کر لی۔ بی۔ اے وہ پہلے ہی کر چکی تھیں۔ جلد ہی تیاری کر کے ایم اے کر لیا اور کالج میں لکچرر ہو گئیں اور اکلوتی بچی کی دیکھ بھال میں لگ گئیں۔

دو سال کے بعد جب پھر بھائی جان جیل سے آئے تو اپنی سرگرمیوں میں رہے اور بھابی جان کام کرتی رہیں۔ پھر دو بچے اور ہوئے اور وہ انہیں پالتی رہیں۔ اب بھائی جان تین سال سے نظر بند تھے اور ان پر مقدمہ چل

رہا تھا تو بھابی جان بے شمار ذمہ داریوں اور غم کا بوجھ اٹھائے پھرتی تھیں۔ لیکن ان کا چہرہ کبھی میلا نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے غم کو اپنے لئے مسرت سمجھنے لگی ہیں اور غم میں بھی خوشی کا پہلو نکال ہی لیتی ہیں۔

وہ صبح سویرے اٹھتیں، بچوں کو نہلاتیں، ان کے کپڑے بدلتیں، خود نہا دھو کر تیار ہو جاتیں۔ بچوں کو کھلا پلا کر سات بجے اسکول بھیج دیتیں۔ پھر ملنے والوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ طرح طرح کے لوگ ان سے ملنے آتے اور طرح طرح کی فرمائشیں کرتے۔ کوئی ان سے ملازمت کے لئے سفارش کرنے کو کہتا، کوئی کسی اور کام کے لئے۔ سب آدمی انہیں بڑے آدمی کی بیوی اور بہو سمجھتے تھے۔ کوئی یہ نہیں سمجھتا تھا کہ بھابی جان کا تعلق اب بڑے لوگوں سے صرف چھوٹے لوگوں کی وجہ سے رہ گیا ہے۔ وہ بڑے لوگوں کے پاس صرف سفارشیں لے کر جاتی ہیں ورنہ بڑے لوگوں سے اب انہیں دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں۔ بھابی کالج جاتیں اور وہاں بھی پڑھانے کے علاوہ ہر لڑکے کے معاملات میں دلچسپی لیا کرتیں۔ کالج سے آکر پابندی کے ساتھ کئی کئی خط روز لکھتیں اور انہیں ڈاک میں ڈلواتیں۔ عام طور پر یہ خطوط نئے لکھنے والوں کے نام ہوتے تھے، جو ہر روز انہیں خط لکھا کرتے تھے۔ بھابی نے محض دل بہلانے اور وقت کاٹنے کے لئے لکھنا شروع کیا تھا۔ مگر وہ بہت اچھا لکھنے لگی تھیں۔ اور نئے لکھنے والے ان سے مشورے طلب کرتے اور وہ بڑی محبت کے ساتھ ان کے خطوں کا جواب دیا کرتیں، اس طرح کہ نئے لکھنے والے نہ تو غلط فہمیوں کا شکار ہو کر بہک جائیں اور نہ ان کی دل شکنی ہو۔ پھر وہ شام کو ایک جگہ ٹیوشن پڑھانے چلی جایا کرتی تھیں۔

یعنی صبح جاگنے کے بعد سے سوتے وقت تک کام آدمی کا سا مشین معلوم ہوتی تھیں۔ ان کے خط لکھنے کے شوق سے تنگ آکر میں نے کہا۔

'بھابی آپ نے کیا علت پال رکھی ہے۔ کالج میں تو سر کھپاتی ہی ہیں، گھر پر بھی ایک کالج بنا رکھا ہے۔'

بھابی بڑے باوقار انداز میں مسکرائیں اور بولیں۔

''اختر! ان نئے لکھنے والوں کو کیسے بھول سکتی ہوں۔ یہ تو ہمارے مستقبل کی امیدیں ہیں۔ اگر میں ان پودوں پر روز چھڑکاؤ نہیں کر سکتی، ان کی خدمت نہیں کر سکتی کہ ان میں پھول لگیں اور سارا باغ مہک اٹھے، تو کم سے کم جو کچھ کر سکتی ہوں، وہ تو کرنا چاہئے۔''

اس جواب کے بعد کچھ اور بولنے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ میں چپ ہو رہا۔ ایک دن سنام کے وقت وہی لڑکی شمی ان کے پاس آئی۔ وہ بہت اداس تھی وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ لیکن پھر بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔ بار بار اس کے ہونٹ کانپ کر رہ جاتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب وہ رو دے گی۔ بھابی نے حسب عادت اسے بٹھایا اور باتیں کیں۔ پھر آنے کی وجہ پوچھی تو وہ کچھ بھی نہ بولی۔ بھابی جتنے اصرار کے ساتھ پوچھتیں۔ معلوم ہوتا کہ اس کے ہونٹ اتنی ہی شدت کے ساتھ آپس میں چپکتے جاتے تھے۔ آخر وہ کچھ نہ بول سکی تو بھابی نے اسے پکڑا اور سونے کے کمرے میں لے گئیں۔ دروازہ اندر سے بند کیا اور پوچھا کہ کیا بات ہے؟ لیکن شمی کچھ بتانے کے بدلے رونے لگی اور بھابی کے چپ کرانے پر بھی روتی گئی اور بڑی دیر کے بعد بھابی کے ڈانٹنے پر اس نے بتایا کہ دوسرے ہی دن اس کے بھائی کے ایم اے کی فیس داخل کرنی ہے اور روپے کا انتظام نہیں ہو سکا ہے۔ اب وہ اس بات پر شرمندہ تھی کہ بھابی اس کے کالج کا خرچ دیتی ہیں، اب وہ بھائی کے لئے فیس مانگے۔ لیکن دوسرا کوئی اور ایسا ہمدرد بھی نہ تھا، جس کے سامنے وہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتی اور وہ صرف اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے ان کے پاس آئی تھی۔

بھابی نے بڑی محبت سے شمی کے گال پر ایک چپت لگائی اور بولیں۔

'پگلی! اس میں رونے کی کیا بات تھی۔ آخر اس میں شرمانے کی کیا بات ہے۔ ہم لوگ اسی طرح تو ایک دوسرے سے کہہ کر اپنا دکھ درد ہلکا کر سکتے ہیں۔'

یہ کہہ کر انہوں نے الماری کھولی اور چھوٹی چھوٹی سونے کی دو چوڑیاں لا کر شمی کے ہاتھ پر رکھ کر بولیں۔

'لے جاؤ اسے بیچ کر تمہارا بھائی فیس ادا کر سکے گا۔'

شمی شاید گر جاتی لیکن بھابی نے اسے سنبھال لیا اور اس کی پیشانی چوم لی اور بولیں۔ 'شمی! سدا ایسا ہی زمانہ نہیں رہے گا۔ دن بدلیں گے۔ جاؤ، سویرے چلی جاؤ، پھر اندھیرا ہو جائے گا۔'

شمی چوڑیوں کو لے کر چلی گئی۔ یہ چوڑیاں وہ تھیں، جو دو دن پہلے بھابی جان نے ننھی ریحانہ کے لئے بڑی مشکل سے پیسے بچا کر بنوائی تھیں اور جسے ریحانہ نے صرف ایک بار پہنا تھا۔

چوڑیاں دے کر بھابی جان بہت خوش تھیں۔ جیسے ان کے دل سے پہاڑ جیسا کوئی بوجھ اتر گیا ہو۔

میں چار دنوں سے ان کے پاس تھا اور ایک ضروری کام کے سلسلے میں ان سے مشورہ کرنے آیا تھا۔ لیکن ان کی مصروفیتیں اور پریشانیاں دیکھ کر نہ موقع ملا اور نہ ہمت ہو سکی اور میں نے سوچ لیا کہ بھابی سے بغیر کوئی مشورہ کیے اور مدد مانگے واپس جاؤں گا۔ حالاں کہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ صرف وہی ایسی آدمی تھیں جو اس سلسلہ میں میری مدد کر سکتی تھیں۔ لیکن میں نے فیصلہ کر لیا کہ ان سے ہرگز نہیں کہوں گا۔

آخر بھابی نے خود ہی کہا۔ 'تم چار دنوں سے آئے ہو، لیکن کوئی بات تک نہیں کی۔'

میں نے کہہ دیا۔ 'میں صرف ٹہلنے اور آپ سے ملنے آ گیا تھا بھابی۔'

پھر وہ بولیں۔ 'اور تمہاری شادی کا کیا ہوا؟ سنا ہے تم میں اور تمہارے گھر والوں میں شادی کے مسئلے پر سخت اختلاف ہو گیا ہے۔'

'جی ہاں — شادی کرنے کا مطلب ہے کہ یا تو میں امی کی پسند کے مطابق ایک احمق لڑکی سے شادی کر لوں یا پھر چپ بیٹھا رہوں۔'

'اور وہ جمیلہ! تم تو جمیلہ سے شادی کرنا چاہتے تھے نا۔' بھابی بولیں۔

'اب بھی چاہتا ہوں۔ لیکن امی نے کہہ دیا ہے کہ جمیلہ اس گھر میں بہو بن کر داخل نہیں ہو سکتی۔' میں نے کہا۔

'یہ تو بڑا ظلم ہے۔'

'ہے تو لیکن کیا کیا جائے۔ بہت سے ظلم برداشت کرنے پڑتے ہیں۔'

'تو اپنی امی کی پسند سے شادی کر لو پھر۔'

'یہ بھی نہیں کر سکتا بھابی۔'

'پھر کیا سوچا؟'

'شادی تو جمیلہ سے ہی کروں گا اور گھر چھوڑ دوں گا۔' میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

'تو پھر بسم اللہ۔ بیاہ کر لے آؤ۔ یہاں میرے ساتھ رہے گی۔ میں بھی اکیلی ہوں۔'

اُف — بھابی کے یہ جملے سن کر میرا سر چکرا گیا۔ یہ عورت ہے یا عزم و ہمت کا ستون۔ ہر روز ایک نیا بوجھ

اپنے لئے بڑھائے جاتی ہیں۔ خود اپنی ضرورتیں اور ذمہ داریاں کیا کم ہیں، مگر ہمت ہے۔ اور صرف ہمت کے سہارے شوہر کی دوری اور نظر بندی کا غم ہنس ہنس کر بھلائے جاتی ہیں۔ میں نے سوچ سمجھ کر جواب دیا۔

'میں بھی یہی سوچ رہا تھا لیکن ابھی دیر ہوگی بھابی۔ جمیلہ بیمار ہے ابھی۔'

جمیلہ بیمار نہیں تھی، بالکل اچھی تھی۔ لیکن اگر میں یہ نہیں کہتا تو وہ پھر ضد پر آجاتیں۔ حالاں کہ حقیقت یہ تھی کہ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ بھابی سے مشورہ کرنے کے بعد ہی جمیلہ سے شادی کرلوں گا اور اسے ان کے پاس رکھ کر کہیں تلاش روزگار میں نکلوں گا۔

بھابی جمیلہ کی بیماری کی خبر سن کر بہت افسوس کرنے لگیں اور بولیں۔

'سچ مچ جمیلہ بڑی پیاری لڑکی ہے۔'

پھر میں باہر چلا گیا اور سوچا کہ رات کی گاڑی سے چلا جاؤں گا۔ چار بجے واپس آیا تو دیکھا کہ بھابی جان بہت اداس بیٹھی ہیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک تار ہے جس کو وہ ہاتھ میں لئے ہوئے بس دیکھتی جارہی ہیں۔ ان کے چہرے کا گورا رنگ بالکل سنولایا ہوا تھا۔ میں چپ چاپ ان کے پاس جاکر بیٹھ گیا اور پوچھا۔

'تار کیسا ہے بھابی جان؟'

'اختر۔۔۔'

بھابی جان نے تار میرے ہاتھ میں دے دیا اور میز پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر بچوں کی طرح رونے لگیں۔

میں نے تار پڑھا۔ بھائی جان کو چار سال کی سزا ہوگئی تھی۔ میں نے کچھ دیر کے بعد بمشکل کہا۔

'بھابی جان صبر کیجئے۔ ابھی تو آپ کو ایسے امتحانوں کی منزل سے اور بھی گزرنا باقی ہے۔'

اور بھابی کو جیسے سکون آگیا۔ وہ اٹھ بیٹھیں اور بولیں۔۔۔

'ٹھیک کہتے ہو اختر۔ میں اگر پریشان ہوئی تو بچے اور پریشان ہوں گے۔'

اتنا کہہ کر وہ اٹھیں اور منہ ہاتھ دھونے چلی گئیں۔ جب واپس آئیں تو معلوم ہوتا تھا کہ بس ایک لہر تھی جو آئی اور گزر گئی۔ لیکن ہم لوگ جتنی دیر تک چائے پیتے رہے، بھابی کی نظر بار بار پرانے سنگار میز پر رکھی بھائی جان کی تصویر کا طواف کرتی رہی۔ اسی وقت انہوں نے بتایا کہ ان کے پاسپورٹ کی درخواست نامنظور ہوگئی ہے اور اسی

رات انہیں دہلی جانا بہت ضروری ہے۔

اسی رات بھابی جان دہلی چلی گئیں— اور میں بھی واپس ہوگیا۔ رات کے سناٹے میں ریل گزرتی جارہی تھی اور مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اندھیری رات میں بھابی جان مجھے روشنی دکھا رہی تھیں۔ ریل تیزی کے ساتھ گزرتی جارہی تھی اور میرے دل میں نئے ارادے، نئے حوصلے پیدا ہورہے تھے۔ نئی امیدیں اور نئی امنگیں جاگ رہی تھیں۔

لفظ و معنی

کلیسا	۔	گرجا، عیسائیوں کی عبادت گاہ
احتجاج	۔	اعتراض، حجت، انکار
ملازمت	۔	نوکری، خدمت میں رہنا
سراپا	۔	سر سے پاؤں تک کی تصویر کشی
نجات	۔	رہائی، چھٹکارا
صلیب	۔	عیسائیوں کا مقدس نشان
جبر	۔	ظلم، ستم
ملازم	۔	نوکر، خادم
ستون	۔	کھمبا
عزم	۔	ارادہ، نیت، جمع عزائم

آپ نے پڑھا

- سہیل عظیم آبادی کی کہانی 'بھابی جان' میں آپ نے رقیہ بھابی کے روپ میں عورت کے ایک ایسے کردار کے بارے میں پڑھا جو مہر و وفا اور ایثار و قربانی کی ایک خوبصورت مثال ہے۔ کہانی جیسے جیسے آگے بڑھتی جاتی ہے، رقیہ بھابی ہمارے دلوں میں اپنا ایک مستحکم مقام بناتی جاتی ہیں۔ دراصل کہانی میں ان کی پوری شخصیت ایک شمع کی طرح قارئین کے سامنے آتی ہے، شمع جو خود جلتی اور پگھلتی رہتی ہے اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اس کا وجود ختم ہوجاتا ہے۔ لیکن اس کی روشنی سے نہ جانے کتنے تاریک ذہن منور ہوتے رہتے ہیں۔

- رقیہ بھابی پر گھر کی تمام ذمہ داریاں تھیں، بچوں کی تعلیم وقت پر ان کے کھانے پینے کا انتظام، اپنے دیور کی خاطر داری، رقیہ بھابی ہمیشہ مالی دشواریوں سے دوچار رہتی تھیں۔ اس لئے کہ وہ جس کالج میں لکچرر تھیں وہاں سے ان کو صرف چار سو روپے ماہانہ تنخواہ ملی تھی۔ بھابی ایک لڑکی کو ٹیوشن بھی پڑھاتی تھیں اس سے پچاس روپے مل جاتے تھے۔ لے دے کر یہی ان کی کل آمدنی تھی اور خرچ بہت زیادہ..... ان کے شوہر کو سیاست کا شوق تھا جس کی وجہ سے انہیں بار بار جیل جانا پڑتا تھا۔
- رقیہ بھابی نے تمام باتوں کے باوجود کبھی اپنے شوہر کا حوصلہ پست نہیں ہونے دیا اور تنہا سارا غم جھیلتی رہیں۔ انہوں نے غموں کے درمیان خوش رہنا سیکھ لیا تھا۔ وہ ایک انتہائی ہمدرد اور مخلص عورت تھیں۔ غریبوں اور بے سہارا لوگوں کی مدد کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ غریب بچیوں کی تعلیم اور ان کی شادی وغیرہ کے موقع پر بھی وہ مدد کرنے سے باز نہیں آتی تھیں۔ دوسری طرف ان کے شوہر کو سیاسی سرگرمیوں میں پیش پیش رہنے کی وجہ سے زیادہ تر جیل میں ہی رہنا پڑتا تھا اگر کبھی کچھ دنوں کے لئے رہائی بھی ہوتی تھی تو پھر کسی دوسرے مقدمے میں جلد ہی سزا ہو جاتی تھی۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود رقیہ بھابی نے کبھی خود کو مجبور اور بے سہارا نہیں محسوس کیا اور اپنے نامساعد حالت کے باوجود ہمیشہ دوسروں کو حوصلہ اور سہارا دیتی رہیں۔
- سہیل عظیم آبادی کی یہ کہانی زبان، اسلوب اور ہیئت کے اعتبار سے ایک کامیاب اور عمدہ کہانی ہے۔ اس کا موضوع نیا نہیں ہے بلکہ بہت پرانا اور عام موضوع ہے پھر بھی کہانی پڑھنے والوں کو ایک نیا عزم اور حوصلہ دیتی ہے۔ ساتھ ہی یہ سبق بھی کہ انسان اگر چاہے تو دشواریوں اور پریشانیوں کے درمیان بھی اپنے لئے جینے کی راہ نکال سکتا ہے۔

مختصر ترین سوالات

1. سہیل عظیم آبادی کہاں پیدا ہوئے تھے؟
2. سہیل عظیم آبادی کے بچپن کا نام کیا تھا؟
3. سہیل عظیم آبادی کے افسانوں کے پہلے مجموعہ کا نام کیا تھا اور وہ کس سال شائع ہوا تھا؟
4. سہیل عظیم آبادی کی ابتدائی تعلیم کس مدرسے میں ہوئی تھی؟

مختصر سوالات

1. رقیہ بھابی کے جس دیور کا کردار کہانی میں پیش کیا گیا ہے اس کا نام کیا تھا؟
2. رقیہ بھابی کے شوہر کو بار بار کیوں جیل جانا پڑتا تھا؟
3. رقیہ بھابی کس لڑکی کی تعلیم کا خرچ خود برداشت کرتی تھیں اور کیوں؟
4. رقیہ بھابی کو سونے کی چوڑیوں کو کیوں فروخت کروانا پڑا تھا؟
5. رقیہ بھابی کو جب فرصت ملتی تھی تو وہ اپنا شوق پورا کرنے کے لئے کون سا کام کیا کرتی تھی؟

طویل سوالات

1. رقیہ بھابی کا سراپا کم از کم دس جملوں میں تحریر کریں۔
2. رقیہ بھابی کے کردار کو ایک مثالی کردار بنا کر سہیل عظیم آبادی نے قاری کو حوصلہ دینے کا کام کیا ہے، اس خیال سے آپ کس حد تک اتفاق کرتے ہیں؟
3. سہیل عظیم آبادی اردو کے کس افسانہ نگار سے بہت زیادہ متاثر تھے اور کیوں؟
4. افسانہ بھابی کے کس کردار نے آپ کو سب سے زیادہ متاثر کیا اور کیوں؟
5. سہیل عظیم آبادی کے بارے میں اپنے اردو کے استاد سے مدد لے کر کم از کم دس جملے تحریر کریں، ساتھ ہی یہ بھی تحریر کریں کہ ان کے افسانوں کے دوسرے مجموعہ کا نام کیا تھا اور وہ کب شائع ہوا تھا؟

آیئے، کچھ کریں

1. بہار کے چند اہم افسانہ نگاروں کے ناموں کی ایک فہرست بنایئے۔
2. اگر آپ کی نگاہ میں رقیہ بھابی جیسا کوئی دوسرا کردار ہو تو اس کا تعارف تحریر کریں۔